سقوط مشرقی پاکستان اور اردو ناول

ڈاکٹر رانی صابر علی*

Abstract:

"The Fall of Dhaka " is the greatest tragedy in the political History of Pakistan. A Great Number of Novelist have written on this topic. The most important of all these are "Chalta Musafir, Tanha, lahu ka Safar , Raakh, Allah maigh dy , Tanha & Sadion ke zanjeer" These novels contain all those reasons due to which Pakistan was divided in to parts in 1971. After 1971 the great transformation that occured in urdu novel writting has been described in this artical. This artical exhibits that novelists declare the difference of language , geography distance and the lack of resourses were the reasons of the partition of Pakistan.

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں سقوط مشرق پاکستان ایک اہم موڑ ہے جس نے اردو ناول میں جا بجا اپنی جھلکیاں دکھائی ہیں ۱۹۴۷ء کے قیام کے بعد یہ پہلا بڑا دھچکا تھا جو مسلمانوں کو لگا ادباء اور شعرا نے اس سانحے کو دل سے محسوس کیا اور اپنی اپنی تخلیقات میں اسے پیش کیا۔ سقوط مشرقی پاکستان (۱۹۷۱ء) کی وجوہات میں سب سے اہم بات اس کا تاریخی اور جغرافیائی پس منظر ہے کہ لسانی ذہنی علاقائی اور نظریاتی اختلافات بہت بڑھ چکے تھے ایسے میں ۱۹۷۱ء میں مارشل لا سے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں میں غم و غصے اور شدید جذبات کا طوفان اُمڈ پڑا وہ لاوا جو کہ آہستہ آہستہ پک رہا تھا اچانک پھٹ پڑا اور قتل و غارت گری اور بے حسی کے طوفان نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بالآخر ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو جنرل نیازی نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے اور یوں دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی

* شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، ساہیوال۔

جگہ بنگلہ دیش ہو گیا۔ یہ المیہ ادیبوں کی تحریروں میں بہت واضح نظر آتا ہے۔صدیق سالک کی کتاب ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' کا یہ اقتباس دیکھیں۔

'میجر جنرل ناگرہ ایک گولی فائیر کئے بغیر ڈھاکہ میں داخل ہو گیا اس کے ساتھ ہی بھارتی فوج اور ڈھیر ساری فاتحانہ نخوت تھی۔عملاً یہ ڈھاکہ کا اختتام تھا اگر چہ اسے دفن کرنے کی رسوم بھی ابھی باقی تھیں ڈھاکہ یوں چپ چاپ سو گیا جیسے اچانک حرکت قلب بند ہو گئی ہو وہاں کوئی مار کٹائی نہ ہوئی نہ دہرائی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈھاکہ غلامی میں ڈوب گیا''(۱)

''سقوط مشرقی پاکستان'' کے سانحہ نے عام لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا جذبات مجروح ہوئے اور نقصان کا احساس بڑھ گیا۔۔ادب معاشرے کے ہر بدلتے دھارے کو اپنے اندر سموتا اور بیان کرتا ہے اردو ناول میں بھی اس سانحے کو بہت سے ناول نگاروں نے لکھا۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں۔

''پاکستان کی سیاسی سماجی اور تہذیبی زندگی میں سقوط ڈھاکہ کا واقعہ ناقابل فراموش ہے ایسے الم انگیز تاریخی سروکار پاکستان کی سیاسی تاریخ کا انمٹ حصہ ہیں اتفاق سے اس اتنے بڑے المیے پر زیادہ ناول تصنیف نہیں ہوئے لیکن چار ناول نگاروں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے یقیناً اور بھی ناول نگار ہونگے۔لیکن فی الحال ان چار ناول نگاروں الطاف فاطمہ ''چلتا مسافر''(۱۹۸۱ء) طارق محمود ''اللہ میگھ دے''(۱۹۸۶ء)، سلمی اعوان ''تنہا''(۱۹۸۹ء) اور رضیہ فصیح احمد کا ''صدیوں کی زنجیر'' (۱۹۸۸ء) ہیں۔الطاف فاطمہ کا ناول چلتا مسافر مشرقی پاکستان انڈیا کے صوبے بہار سے شروع ہو کر وہاں پہنچتا ہے جہاں ان لوگوں کو شدید تکالیف اذیت اور قتل و غارت گری کا سامنہ کرنا پڑا۔''(۲)

یوں آغاز ہی میں ہمیں ''چلتا مسافر'' کے اختتام کا پتا چل جاتا ہے ناول کے آغاز میں صفحات کو پڑھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنفہ کیا کہنا چاہتی ہے اور اس کا موضوع کیا ہے۔

ہندو مسلم فسادات کی لہریں اس ناول کے ہر صفحے پر اپنا عکس چھوڑتی ہیں ان مناظر کے بعد کرداروں کو پھر سے ہنستا کھیلتا اور زندگی کی طرف لایا گیا۔اسی ہنسی اور کھیل میں کرداروں کے اندر امیدیں خواب اور امنگیں جنم لینے لگتی ہیں غم کے سائے چھٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

''آنگن'' کی طرح سے اس ناول کی فضا میں بھی سیاسی اثرات گھر کی چار دیواری کے اندر موجود ہیں افراد کے دل میں پاکستان بننے کا احساس اور آزاد زندگی بسر کرنے کی خواہش ہے کانگرس مسلم لیگ، قائداعظم ،نہر

و اور مختلف سیاسی جماعتوں کی آپس کی چپقلش اس میں نمایاں ہے۔ آنگن ہی کی طرح سے ایک ہی گھر میں رہنے والے افراد کی نظریاتی وابستگی بھی الگ الگ ہے اور ان کے آدرش بھی جدا ہیں سرکار بیگم کہتی ہیں۔

ایک ہی ملک کے رہنے والے باشندے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے تھے، تم بنگالی ہو؟ تم بہاری ہو؟ تم پنجابی ہو؟ یہ جملے ہر کوئی ایک دوسرے سے بول کر اعتبار کی زمین پر اپنے گرتے قدم دوبارہ رکھنا چاہ رہا تھا۔ رشتے ناطے، انسانیت اور قدریں اس وقت تباہ ہو جاتی ہیں۔ جب انسان نسل پرستی کی آڑ میں ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں اس وقت انسانیت کہیں دور کھڑی قہقہے لگا رہی ہوتی ہے۔ کیونکہ جب بھوک سر سے ہو کر پیٹ تک پہنچتی ہے تو پھر کچھ نہیں بچتا ہے۔ بھوک کے بعد نفرت کی آگ ہے جو جلا کر انسانوں کو بھسم کر دیتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں بھی لاشوں کے انبار تھے اور ۱۹۷۱ء میں بھی یہی صورت حاصل تھی۔

بنگلہ دیش میں آ کر پنجاب کے لوگوں کا رویہ بنگالیوں کے ساتھ عجیب تھا، جس کو وہ لوگ محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ اکثر جگہوں پر وہ ان جملوں کو برداشت کرتے تھے۔

> ''پھر یہ گندے بھی بڑے ہوتے ہیں بنگالی، ذرا دیکھو تو کتنی سڑی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں پاس ہی جوہڑ ہوتے ہیں۔ مکھی، مچھر اور چنگڑی، ماچھ بنیں یہی ہے ان کا مقدر''(۳)

ناول کا مرکزی کردار مزمل بچپن سے سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا دکھایا گیا ہے بعد میں یہ بصیرت ہی ہے جو ناول کو اس کے ذریعے آگے، بڑھتا دکھاتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کا کردار سوچتا بھی ہے اور خود کلامی بھی کرتا ہے اس کا سیاسی و سماجی فلسفہ شروع سے آخر تک ناول پر چھایا ہوا ملتا ہے لیکن اس کے کردار میں کچھ کر دینے کا عزم نہیں ہے اگر یہ عزم ہوتا تو شاید کچھ کرتا بھی۔ اس میں وہ کشش بھی نہیں جو سلسبیل اور بذلل کے کردار میں ہے سلسبیل لاہور کی ہے اور بذلل بنگلہ دیشی اور مکتی باہنی۔ مکتی باہنی تحریک نے جس طرح سے طلباء کے ہاتھ سے قلم چھین کر انہیں ہتھیار پکڑا دیئے تھے اس کی بازگشت ناول کے صفحات میں موجود ہے۔

> ''چھوڑو یونیورسٹی کو، جہنم میں جائے، مجھے کچھ یاد نہیں، بھول جاؤ کہ ڈھاکہ شہر میں کوئی یونیورسٹی بھی تھی''(۴)

بذلل اگرچہ مکتی باہنی ہے مگر انسانی ہمدردی اس کے اندر اس قدر موجود ہے کہ وہ اپنی جان کو مصیبت میں ڈال کر مسلسل مزمل کے گھر کی دیکھ بھال میں رہتا ہے اسے اس بات کی بھی پروا نہیں کہ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ سکتا ہے اور موت کے منہ میں اُتر سکتا ہے اس کی یہی بہادری اور بیبا کی اس کو مزمل کے کردار سے آگے لے جاتی ہے اور قاری کو نا صرف اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے بلکہ وہ اس کے موقف کا قائل بھی ہو جاتا ہے۔

طارق اسماعیل ساگر کا ''لہو کا سفر'' اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں بھی سقوط ڈھاکہ جیسے بڑے اور عظیم سانحے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کا ہیرو شیر افگن جو کہ مرکزی کردار ہے پاک فوج کی کمانڈو بٹالین کا کیپٹن تھا۔ ہنگامی صورت حال کے پیش نظر اُسے جنوری ۱۹۷۱ء میں ڈھاکہ بھیجا گیا یہ پورا سفر پوٹھوہار سے سلہٹ تک کی کہانی پر مشتمل ہے۔ مرکزی کردار پہلے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے زمانہ اور پھر حال میں آ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ۶۵ء کی جنگ میں وہ اپنے کچھ فرائض ادھورے چھوڑ آیا تھا۔ اور ان کی تکمیل کیلئے اسے ۷۱ء میں ڈھاکہ بھیجا گیا ہے لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی اس کے سامنے اپنے ہی لوگ تھے جن سے اسے مقابلہ کرنا تھا تو سوچتا ہے:۔

> ''اور آج جب میں ڈھاکہ پہنچا تو سوچ رہا تھا خدایا کس امتحان میں ڈال دیا ہے میں یہاں ہندو سے لڑنے سے آیا ہوں یا اپنے مسلمان بنگالی بھائیوں سے؟ روزانہ کوئی نہ کوئی پریشان کن خبر مل جاتی تھی۔ آج فلاں جگہ مکتی باہنی نے محبّ وطن پاکستانیوں پر حملہ کیا۔ آج فلاں جگہ پر دشمن کی سازش پکڑ گئی''**(۵)**

ناول میں مشرقی پاکستان میں جو ''را'' کی تنظیمیں کام کر رہی تھیں۔ ان کا واضح نام لیا گیا ہے اور اس بات پر تاسف کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ مسلمان بنگالی اپنے ہی بھائیوں اور ہم مذہب ساتھیوں کو چن چن کر مار رہے ہیں۔ عظمٰی ناول کے سیاسی و سماجی جبر میں جس روشنی کی علامت بن کر آتی ہے وہ روشنی آگے چل کر علامتی سطح پر دوسرے ناول نگاروں کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ عظمٰی واحد کردار ہے جو سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے کی جانے والے جدوجہد میں عورت کی نمائندہ بن ہے۔ ایسے مزاحمتی کردار ادب میں عورت کے حوالے سے بہت کم ملتے ہیں۔ موت کو سامنے پا کر وہ جس بہادری سے گفتگو کرتی ہے اور اپنے نظریات سے وابستگی کا اعلان کرتی ہے۔ وہ بہت حیران کن ہے۔ وہ جس سماج کا حصّہ ہے وہاں ہر طرف گھناؤنے کاروبار کی چادر بچھی ہوئی تھی مگر اس نے ایسی چادر کو اوڑھنے سے سر کو ننگا رکھنا زیادہ بہتر سمجھا اور آگے بڑھ کر موت کو بڑی بہادری سے گلے لگا لیا اس کا شیر افگن کے نام لکھا آخری خط اور معظم سے اس کی آخری گفتگو بہت پر تاثر ہے۔

> ''دشمن ایسٹ پاکستان پر بس نہیں کرے گا اس کے عزائم بہت بھیانک ہیں ابھی اس سانپ نے اپنا ایک ہی بل کھولا ہے ابھی اس نے صرف ایک ہی ڈنک ہمارے جسد ملی پر مارا ہے وہ ہمیں اور ڈسے گا اس کا زہر ابھی اور پھیلے گا شیر افگن تم میری قوم کی رگوں میں اس زہر کو کبھی نہ پھیلنے دینا اس کا کوئی نہ کوئی تریاق ضرور تلاش کر لینا''**(۶)**

''لہو کا سفر'' اگرچہ جذباتی ناول نگاری کے زمرے میں آتا ہے لیکن بغیر جذبات کی عکاسی کے صرف حقائق بیان کر دیئے جاتے تو یہ صرف اخباری سرخیاں بن کر رہ جاتی ہیں سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے جانے

والے ناولوں میں اس کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہے۔ کیونکہ ناول نگار نے اس دور کے واقعات کو سامنے رکھ کر داروں کی بنت کی ہے اور اسی زمین میں ان کو رہتا اور بستا دکھایا گیا ہے۔ اس دور میں طلبا تنظیمیں جس طرح سے متحرک تھیں اور کالج یونیورسٹی میں جس طرح سیاست در آئی تھی کرداروں کی زبانی اس کا بیان بڑا واضح ہے اور یہ حقیقت ہے کہ سیاست دان پہلے انہی معصوم ذہنوں اور جوان گرم خون کو متحرک کرتے ہیں اور پھر اپنی مرضی کے مطابق اُن سے کام لیتے ہیں۔

مستنصر حُسین تارڑ کا ناول ''راکھ'' بہت سے حوالوں سے اہم ہے، تہذیبی، سماجی، سیاسی اور مذہبی حوالوں کی بنت سے سامنے آنے والا یہ ناول اپنے اندر بہت سی تہیں سموئے ہوئے ہے، یہاں پر جو کردار ہیں وہ اپنی جڑوں سے وابستہ ہیں اور کسی بھی طرح سے اپنی جڑوں اور اپنی شناخت کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ''راکھ'' میں ایک عجیب دُکھ اور بے نام سی اداسی ہے جو کہ کرداروں کو اپنی انتہا تک لے جاتی ہے وہ کبھی ماضی میں رہ جاتے ہیں اور کبھی حال میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ نظریاتی طور پر حاصل کئے گئے ملک میں اپنی ہی لغزشوں کے باعث بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے سے ہو رہے تھے۔ بظاہر بنگالی اچانک ہی بنگلہ دیش کی حد بندی کے باعث مغربی پاکستان میں جہاں بھی تھا نے اپنے خیالات واحسات سمیت قیدی بن کر رہ گیا تھا مردان جیسا لبرل آدمی بھی شوبھا کو ہدایت کرتا ہے کہ اگر باہر کہیں اسے چیک کیا جائے تو وہ کبھی کسی کو نہ بتائے کہ وہ بنگالی ہے۔ کراچی چیک پوسٹ پر اُس کی فوکسی کو چیک کیا جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بنگالی بتا دیتی ہے جس پر فوجی آفیسر گرفتار کرنے کے لئے کہتا ہے لیکن آفیسر کمال کے کہنے پر اُس کو جانے دیا جاتا ہے۔ اس ناول میں صرف سقوط ڈھاکہ ہی نہیں بلکہ اس کے بعد کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ کیسے کراچی میں حالات میں بدامنی ہوئی مہاجر بنگالی اور مقامیوں کے درمیان حالات خراب ہوئے تو بہت سارے لوگوں کو یہ احساس ہو گیا کہ یہ ملک اب ان کا نہیں۔ یہ کیسا عجیب اور تلخ احساس تھا کہ جس جگہ پر بچپن سے جوانی تک اُن کی جڑیں گہری تھیں وہ اُن کے لئے اجنبی ہو چکی تھی۔ اُن کا سوشل سٹیٹس بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ شوبھا کو پورے ناول میں اسی بے یقینی اور بے اعتمادی کی کیفیت میں دکھایا گیا ہے وہ اپنی ذات کا اثبات چاہتی تھی لیکن قدم قدم پر اُس کی شخصیت کو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونا پڑا۔ مردان ''راکھ'' میں ایک خوبصورت فوجی ہیرو کے طور پر سامنے آتا ہے سقوطِ مشرقی پاکستان میں وہ بطور کردار موجود رہتا ہے اور عملی طور پر اس جنگ میں شریک بھی ہوتا ہے اور اپنے نظریے کے ساتھ وابستہ بھی صورت بھی اس سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں پاکستان کا دو ٹکڑوں میں تقسیم ہونا اس کیلئے ایک بہت بڑا المیہ ہے اُس کی سوچیں بھٹکتی ہیں اور اُسی سانحہ کی طرف بار بار لے جاتی ہیں۔

مردان ایک محبِّ وطن کے طور پر سامنے آتا ہے جب بھی وہ کوئی ایسا واقعہ دیکھتا ہے جس سے ملکی سالمیت کو

نقصان پہنچے اس کی آنکھوں میں چنگاریاں پھوٹنے لگتی ہیں اس کی ملازمت کا ابتدائی عرصہ جدوجہد میں گزرتا ہے اور بعد کا عرصہ وہ سکول میں اُستاد بن کر گزارتا ہے سقوط مشرقی پاکستان جو اُس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا اسی پر ناول کا اختتام ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے معاملے میں ناول میں تعصب سے کام نہیں لیا گیا ہے یہاں پر اگر مکتی باہنی کی تخریبی کاروائیاں دکھائی گئی ہیں تو اس کے ساتھ ہی پاکستانی فوجیوں کے وحشی پن اور درندگی کے مظاہرے بھی دکھائے گئے ہیں کہ کیسے انہوں نے عام بنگالیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا اپنا محبوب مشغلہ بنالیا تھا۔ میس ہال کے اند ر رکھی ہوئی تلوار کیپٹن خان زادہ اور گل ریز اتارتے ہیں اور صرف اُس کی دھار چیک کرنے کے لئے بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں اور اپنے سینئر مردان کو اس گھناؤنے کھیل کا جواز یہ بتاتے ہیں کہ اس کھیل میں اُنہیں مزا آ رہا ہے۔

> ''گل ریز نے پشیمانی اور شرمندگی میں ایک اور وار کیا لیکن تلوار کو بند کر کے نہیں۔ ایک نزدیکی فاصلے سے اور عورت کے بدن اور سر کے درمیان جو ایک لوتھڑا تھا شہ رگ تھی رابطہ تھا ایک تار تھی اُسے کاٹ دیا، سر کے بغیر انسان کا دھڑ کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے صرف وہی جان سکتے ہیں جنہوں نے اُسے دیکھا ہو۔''(۷)

''راکھ'' پاکستان میں لکھا گیا لیکن اس میں صرف پاکستان کا سماج نہیں بلکہ بہت سی غیر مُلکی تہذیبوں کا بیان اور مختلف نسلوں کے مرد عورت کے بارے میں لکھا ہے۔ اطالوی یہودی، الجریا، اور انگلستان کے سارے تناز عاتی کردار مختلف جگہوں سے اکٹھے کر کے، ناول نگار نے ناول کے صفحات پر بکھیر دیئے ہیں۔ ڈاکٹر ارشد، کالیا، نوراں، فاطمہ، راڈنی اور بابو پٹیل کے روپ میں الگ الگ نظریات موجود ہیں۔ ناول میں سقوط مشرقی پاکستان کے ساتھ ساتھ دوسرے اہم موضوعات بھی بیان کئے گئے۔

سماجی طور پر ناول کے کردار اپنی مٹی اور اپنی اصل سے جڑے ہوئے ہیں وہ دُنیا گھومتے ہیں لیکن عشق اپنے وطن کی سرزمین اور لہلہاتی فصلوں اور دریاؤں کے پانی سے کرتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ کہ اس پر ایک یا دو تحریریں سامنے آتیں یہ ایک حادثہ تھا اور حادثے کے اثرات جلد ذہن سے نہیں جاتے اس لئے بہت سے اور ناول بھی سامنے آئے ہیں کہیں تو چیدہ چیدہ واقعات ناول نگاروں نے پیش کئے اور کہیں اپنے پورے ناول کی بنیاد ہی اس واقعے پر بنائی اس میں سب سے اہم طارق محمود (۱۹۵۷ء) کا ''اللہ میگھ دے'' ہے۔ یہ ناول شروع سے آخر تک صرف اسی سانحے سے متعلق ہے۔ یہ ناول ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا پیش لفظ ہی اپنے اندر بہت معنویت لئے ہوئے ہیں کیونکہ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ ایک دیس کی کہانی ہے ایک ایسا دیس جو بعد میں

ملک بن گیا۔ آغاز ہی میں ناول میں ایک ٹوٹ پھوٹ اور انتشار دکھایا گیا ہے۔ ناول کا آغاز ہوسٹل کے کمرے سے ہوتا ہے جہاں عمر اور اس کا روم میٹ نورالاسلام موجود ہے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی میں اس کا داخلہ ہو چکا ہوتا ہے اور وہ وہاں کے ہوسٹل میں داخلہ لے لیتا ہے۔ جہاں اس کی ملاقات بہت سے بنگلہ دیشی طلباء سے ہوتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب مشرقی پاکستان میں علیحدگی کا تصور لوگوں کے ذہنوں میں جڑ پکڑ گیا تھا۔ یہ احساس ان کے دلوں میں تقویت پکڑ گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کو ہر حال میں الگ ہو جانا چاہئے۔ ناول کے آغاز میں ہی یونیورسٹی میں سیاست کو اپنی پوری جڑوں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ سٹوڈنٹس کو بوڑھا تلاایں۔ بوڑھا تلاایں کے نعرے لگاتا دکھایا گیا ہے۔ ناول نگار شروع میں ہی اپنے مقصد کا تعین کر لیتا ہے اور یہ مقصد یہی ہے کہ بنگلہ دیش کے آغاز اور اس کے بننے کے عمل کی پوری تحریک کو پڑھنے والوں کے سامنے بیان کرے۔

ان سطور سے ذہن ۶۵ء تا ۷۱ء تک بننے والی عوامی تحریک کی طرف جاتا ہے جب مجیب الرحمٰن شامی کے نکات نے ہر طرف ہلچل مچائی ہوئی تھی اور یونیورسٹی میں کچے ذہن کے کم عمر نوجوان طلباء کو سیاست کیلئے آلہ کار بنایا جارہا تھا کیونکہ سیاست دان جانتے تھے کہ جوان خون کی گرمی قتل و غارت گری کا بازار عمدہ طریقے سے سجا سکتی ہے۔

وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ غیر ملکی اقوام سے جتنا سرمایہ ملکی فلاح کے لئے لیا جارہا ہے اس کا ایک تہائی سے بھی بہت کم مشرقی پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لئے خرچ ہوتا ہے۔ جب کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کا س وقت یہ حال تھا کہ جوش و جذبات میں وہ بے حد جنونی ہو چکے تھے۔

> ''ہمارے منہ سے نوالے چھیننے والو، ہم تمہارے منہ سے نوالے اگلوائیں گے، سنار بنگلہ کی دولت لوٹنے والو تمہارے حساب کے دن قریب ہیں۔ بنگال کی قسمت سے کھیلنے والو! تمہاری جاہ کی بنیاد ہمارے خون پر رکھی گئی ہے۔ اب یہ خون جوش کھا رہا ہے، ابل رہا ہے، بھوک اور افلاس اب ہمارا مقدر نہیں۔ بنگال جاگ چکا ہے۔ ہم نے برابری کی بنیاد پر رشتہ جوڑا۔ تم نے آقا کا روپ دھار لیا۔ ہمیں ٹھوکر کی نوک پر دھر لیا ہم اور ٹھوکریں نہیں کھائیں گے۔ جاگو، جاگو، بنگالی جاگو، جاگو، جاگو، جاگو، بنگالی جاگو۔''(۸)

اقتصادی اور معاشی سطح پر اپنے اس استحصال کو وہ چیخ چیخ کر بتاتے تھے پڑھا لکھا طبقہ بین الاقوامی عالمی منڈیوں سے رپورٹ تمام لوگوں تک پہنچاتا اور پھر یہ تشہیر بنگال کے ہر کونے میں پھیل جاتی ہے۔ دراصل کسی بھی معاشرے میں یکجہتی کی فضا اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے جب لوگوں کی مقامی علاقائی وابستگیوں اور وسیع تر قومی

وفاداریوں کے مابین توازن برقرار رہے یکجہتی کے فروغ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی جماعت اپنی تہذیبی اقدار اقلیتوں پر نہ ٹھونسے، بلکہ باہمی افہام و تفہیم سے یکساں اقدار کو فروغ دینے کے سلسلے میں بھی سعی کرے۔ یکجہتی کو فروغ دینے کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے مابین تصادم کی کیفیت کو دور کیا جائے۔ خواہ یہ معاشی میدان میں ہو یا تہذیبی تضادات کی صورت میں۔ بنگالیوں کا خیال ہے کہ:۔

> ''ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ مغربی پاکستان نے یہاں کے مزاج اور زبان کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ستم یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے کارکن ہراول دستے غداروں کی صف میں کھڑے کر دیئے گئے کبھی تم نے یہ سوچا ہے یہ لوگ نام نہاد غدار کیسے بن گئے یہ لوگ بنگال کے حقوق کی بات کرتے ہیں۔ بنگال کے حقوق کی بات ہر بنگالی کرتا ہے۔'' (۹)

ناول میں بنگلہ زبان کا پرچار بھی ہے کہ کیسے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یہ زبان دل و جان سے عزیز ہے اور وہ اسی کی ترقی چاہتے ہیں۔ دراصل جن معاشروں میں معاشی عدم مساوات ہو۔ وہاں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو تصادم کی کیفیت کو پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اس ناول میں عملی سیاست کم ہے اور اصولوں کی سیاست زیادہ ہے یہاں پر کردار اپنے اپنے نظریات پیش کرتے ہیں اور ان کے بیان میں وہ بہت سختی سے کام لیتے ہیں۔

''اللہ میگھ دے'' سقوط مشرقی پاکستان کی عکاسی اس طرح سے تو نہیں کرتا جیسے اس موضوع پر دوسرے ناول نگاروں نے کی ہے مثلاً، جیل جانا، مکتی باہنی کا شکار ہونا، مہاجر کیمپوں میں جانا اور عملی سیاست کا حصہ بننا۔ اس میں زیادہ تر یونیورسٹی سیاست کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ یا پھر بنگالی طبقے کے کچھ ایسے افراد کو ناول میں اپنے نظریات سمیت شامل کیا گیا ہے۔ جو صرف، بنگلہ زبان، بنگالی مفادات اور مشرقی پاکستان کے استحصال کو بیان کرتے ہیں تاہم اس سانحہ پر لکھے گئے ناولوں میں یہ ایک اہم ناول ہے۔

سلمیٰ اعوان (۱۹۴۵ء) کا ناول ''تنہا'' (۱۹۸۲ء) س المیے پر بڑے خوبصورت اور شستہ لہجے میں لکھا گیا ہے مغربی پاکستان میں مقیم سمیہ علی جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے بچپن سے دلیر اور بہادر دکھائی گئی ہے۔ اس کی سوچیں طبقاتی تقسیم معاشی ناانصافیوں اور ملکی سیاست کی طرف مڑ جاتی ہیں۔ وہ اس وقت کے پاکستان میں رہ رہی ہے جب پاکستان اور بنگلہ دیش الگ نہیں ہوا اور ساری سرزمین ایک ہے، ناول کے شروع میں حیدر جب اپنے دادا کے ساتھ حسین شہید سہروردی کی تقریر سننے جاتا ہے تو اپنے دادا سے کہتا ہے کہ چالیس سال قبل ہندو بنگال کی تقسیم کا شدت سے خلاف تھا اور آج وہ خود ہی اسے تقسیم کرنا چاہتا ہے تو دادا کہتا ہے کہ مسلمان شروع ہی سے سادہ لوح ہے ۱۹۰۵ء میں جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ مشرقی بنگال اور آسام کے صوبے کا قیام عمل میں لایا جائے تو وہ اس وقت مقصد یہ

تھا کہ مسلمان قوم کی حالت کو بہتر بنایا جائے مرکزی کردار سمعیہ علی اور اجتبیٰ الرحمٰن دو الگ تہذیبی نظریات کے باعث ایک نہیں ہو پاتے یہ دونوں کردار مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی وجوہات کے لیے علامتی طور پر سامنے آئے ہیں۔ پاکستان زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کا نعرہ لگانے والوں میں شلپی پیش پیش ہے شلپی اس نسل سے تعلق رکھتا ہے جو پاکستان بننے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھ رہی تھی نئے آدرش کی حامل نئی نسل کسی صورت بھی اپنی کمٹمنٹ سے جدا ہونے کو تیار نہیں۔ اسے مغربی پاکستان اور اُس کے لوگوں سے اختلاف ہے۔ وہ اسے غاصب اور حکمران قوم کہتا ہے جو کہ دور بیٹھی ان لوگوں پر حکم چلا رہی ہے۔

ناول کے کردار چیخ چیخ کر استحصالی طاقتوں کے خلاف بولتے ہیں انہیں لگتا ہے کہ صرف مغربی پاکستان ہی ان کا استحصال کر رہا ہے۔

''ہماری سیاسی محرومیاں دیکھ لیں، اول تو صحیح میں نمائندگی ہی نہیں ملی اگر شومئی قسمت ہمارے لیڈر برسر اقتدار آ ہی گے تو ان کے ساتھ کیا ہوا۔ (۱۰)

سمیعہ اور اجتبیٰ الرحمان دو الگ الگ محاذوں پر اپنی جنگ پورے ناول میں جاری رکھتے ہیں۔ دونوں سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنی اپنی نسل اور تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں ناول میں مشرقی پاکستانی ثقافت جگہ جگہ بکھری ہوئی ہے عورتیں سفید دھوتیوں میں ملبوس اور بوڑھے بچے اور مرد لنگیوں میں ملبوس آزادنہ گھومتے ہیں۔ ناول میں نچلے طبقے کی کی غربت کو دکھایا گیا کہ کیسے تمام بنگالی آج بھی غربت کی لائین کو کراس نہیں کر پائے۔ ناول میں بنگال کے مختلف مناظر پیش کے گئے ہیں۔ اور وہ اتنے حسین ہیں کہ قاری ان کے بیان میں کھو جاتا ہے اور ناول نگار قاری کی انگلی پکڑ کر حسین وادیوں اور بندرگاہوں کی سیر کو نکل پڑتا ہے۔ بنگال کا حسن قاری کی آنکھوں میں چمک بھر دیتا ہے۔ اب تک جتنے بھی ناول اس سانحے پہ لکھے گئے ہیں ان سب میں یہ منظر نگاری بڑے خوبصورت طریقے سے کی گئی ہے اس لئے کہ حسن کے اس بیان کے بغیر ناول نگار آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ ناول میں بنگلہ دیشی روایات، رسم و رواج شادی بیاہ کی محفلیں، تقریبات میں عورتوں اور مردوں کی تیاری اور بنگالی کھانوں میں مخصوص اقسام کا ذکر ہے جس کے بیان کی وجہ سے قاری کو یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ خود مشرقی پاکستان میں موجود ہے۔ مصنفہ نے دراصل اس دکھ کو بیان کیا جو کسی خطے میں رہنے والے اس وقت محسوس کرتے ہیں جب اس خطے کی آدھی زمین کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں جس طریقے سے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں کہانی کی بنت کی گئی ہے۔ وہ قابل داد ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں۔

''سلمیٰ اعوان کا یہ ناول پاکستان کے اتحاد اور قومی یکجہتی کے جذبات کے تحت مصنفہ کا

ان کی بصیرت کے حساب سے حق تھا۔''(۱۱)

رضیہ فصیح الدین کے سنجیدہ تاریخی سیاسی اور سماجی شعور کی پیداوار جس ناول کو کہا جاتا ہے وہ ''صدیوں کی زنجیر'' ہے۔اس ناول کی بنیاد سانحۂ مشرقی پاکستان ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں عام جھوٹی اور بناوٹی باتیں بیان نہیں کی گئی ہیں بلکہ سچائی اور حقیقت نگاری کو بیان کیا گیا ہے جیسے مشرقی پاکستان کا جغرافیائی بعد اور سیاسی وسماجی تقسیم اس سانحے کا باعث بنتی ہے ناول میں بھی ایسی جغرافیائی دوری اور سماجی حالات کی تقسیم آپس میں ملنے نہیں دیتی۔ناول نگار کے پاس جغرافیائی شعور موجود ہے جس کی بناء پر وہ پاکستان کی خوبصورتی اور بنگلہ دیش کی معنویت کو بیان کرتی ہے یہ دونوں حصے جغرافیائی حدود میں بہت دور تھے اور اسی بناء پر یہ دور ہو گئے ایسے ہی ناول میں زری کا کردار ہے جو کہ ایبٹ آباد کی رہنے والی ہے اور شمس الدین ہے جو کہ بنگلہ دیش کا رہائشی ہے اور بنگالی ہے لیکن چونکہ زبان ایک نہ تھی نظریات ایک نہ تھے اور ثقافت ایک نہ تھی اس لئے دنوں مل نہ سکے اگرچہ دونوں کے دل ایک دوسرے کے لئے دھڑکتے تھے۔محبت کے باوجود، جذبات واحساسات کے باوجود ایک نہ ہوسکنا محرومی کے زمرے میں آتا ہے۔خوشی غم اور زندگی کے بارے میں لوگوں کا فلسفہ اس ناول میں نمایاں موجود ہے تاریخ اس ناول میں پس منظر کے طور پر موجود ہے بہت سے واقعات ایسے ہیں جو کہ اگر نہ بھی بیان ہوتے تو کوئی فرق نہ پڑتا مثلا قاسم خان کی پوری داستان کو اگر ناول سے الگ بھی کر دیا جائے تو کہانی کے تسلسل میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔زری کے آباؤ واجداد کی داستان اور اس کے کارنامے ناول کو آگے بڑھانے کے لئے ہیں:

ناول نگار نے مشرقی پاکستان کی مختلف،فصلوں صنعتوں، آب وہوا باغات، اور پھلوں کا اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ پڑھ کر قلم کی داد دینی پڑتی ہے۔

مغربی اور مشرقی پاکستان کے عوام کے دل جیسے قریب تھے اور غیروں کی نفرت کے بچھائے ہوئے جال نے جیسے ان کو دور کر دیا تھا۔ناول میں یہ واقعات بہت واضح ہیں مشرقی پاکستانیوں کے دلوں کا یہ احساس کہ ان کا استحصال ہو رہا ہے۔ہر سطر میں موجود ہے۔ان کا یہ کہنا تھا کہ اپنی بنائی ہوئی اشیاء وہ خرید نہیں سکتے۔صرف اور صرف بیورکریٹ طبقے اور حکمرانوں کے باعث ایسا تھا کہ ان کی قوم ترقی نہیں کر سکی ان کا موقف تھا کہ آج اگر وہ الگ ہوتے تو زیادہ ترقی کرتے اور اپنی مصنوعات سے جیسے چاہتے فائدہ اٹھاتے۔

رضیہ اپنے ملک کے لوگوں کے مسائل، اپنے خطے کی پریشانیاں، مغربی اور مشرقی پاکستان کے عوام کے دلوں کی نفرت اور اس نفرت کے نتیجے میں ہونے والی دوری کو دُکھ سے بتاتی ہیں۔مشرقی پاکستان میں ہونے والے فوجی آپریشن کو بنگالی عوام نے جس طرح محسوس کیا۔ نتیجے میں جنم لینے والی نفرت بھی موضوع ہے کہ فوج کا کام

صاف شفاف نہیں رہا بلکہ بعض فوجیوں کی بہت سی اخلاق سوز کہانیاں بھی عوام نے دیکھیں اور سنیں۔ ۱۹۷۱ء کے سانحے کے بعد مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا مغربی پاکستان آبادی کے لحاظ سے بہت کم رہ گیا۔ برصغیر میں اس کی دفاعی طاقت بھی کمزور پڑ گئی۔ اس سانحے نے پاکستان کے لئے وہی کردار سرانجام دیا جیسے کوئی بم پھٹتا ہے۔ تو اس کے اثرات بہت دور تک جاتے ہیں اور پوری نسل تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اصل واقعات اور سیاسی تحریکیں ان کا آغاز، قیام، تحریکوں کا بننا ٹوٹنا، بگڑنا، اور سیاستدانوں کا ان کے نتیجے میں ختم ہو جانا،، ناول کو اختتام تک لے آتا ہے۔

دونوں ملکوں میں سیاسی وسماجی معاشرتی اور مذہبی حوالے سے کرداروں کی ذہنی ونفسیاتی سوچ واضح کی گئی ہے۔ مشرقی پاکستان میں جو نفرت سے بھری سیاست تھی اور خونی واقعات تھے وہ ناول میں بھر پور طریقے سے نظر آتے ہیں۔

> ''صدیوں کی زنجیر (۱۹۸۸ء) میں رضیہ فصیح احمد نے مشرق پاکستان کو دہرے استحصال کی بدولت بنگلہ دیش بنتے دیکھا اور دکھایا ہے مشرقی سامراج سے آزادی ۱۹۴۷ء میں تاہم ۱۹۷۱ء تک مغربی سامراج کے معنی بدل گئے تھے۔ ان کے نزدیک مغربی پاکستان ہی مغربی سامراج تھا آزادی کے بطن سے آزادی کا نیا سورج طلوع ہوتا ہے تاہم بنگلہ دیش بن جانے کے بعد بھی خون کے غسل کا سلسلہ بند نہیں ہوتا۔'' **(۱۲)**

سقوط مشرقی پاکستان ہماری پاکستانی تاریخ کا یک بہت بڑا المیہ اور سانحہ ہے ایسا سانحہ کہ جس کو پاکستانی عوام نے دل سے محسوس کیا اب دیکھنا یہ تھا کہ ایک ادیب اس حوالے سے کیا سوچتا اور محسوس کرتا ہے اس لئے درج بالا ناولوں کا مطالعہ کیا گیا اور جب اس سانحے کی رُوح کے اندر کرداروں کے ذریعے اترا گیا تو بہت سے حقائق بھی واضح ہوئے جو کہ تاریخی سیاسی اور سماجی ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیبی مذہبی اور معاشی سطح پر بہت اہم تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں۔

> ''بدلے سیاسی حالات متغیر سماجی اقدار، متناقص، معاشرے کے باعث ہر عہد میں کہنہ مسمات، ذہنی احتساب اور تخلیقی قدغنوں کے خلاف مزاحمتی رویوں اور قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔'' **(۱۳)**

یہ بھی تاریخ کا ایک سنگین مذاق ہی ہے کہ مسلم لیگ کی بنیاد ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں رکھی گئی اور ۱۶ ردسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ کے میدان میں ہی اُس کے دوٹکڑے ہو گئے۔ کسی بھی تاریخ واقعے کے ایک دم سامنے آنے کی صورت میں اُس کے پیچھے برسوں اور صدیوں کا لاوا ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ اُبلتا رہتا ہے اور پھر ایک بڑے

آتش فشاں کی مانند پھٹ جاتا ہے۔ایسے تمام حقائق کی عکاسی درج بالا ناولوں کے ذریعے کی گئی ہے۔ناولوں کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اس سانحہ پر لکھے گئے کم وبیش تمام ناولوں میں تاریخی حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ادیب کچھ الگ اور دنیا سے علیحدہ نہیں لکھتا بلکہ وہی کچھ لکھتا ہے جو اُس کے گردوپیش موجود ہے یا رُونما ہو رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ صدیق سالک، ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا''، مطبع قومی پبلی شرز، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۷

۲۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، ''اُردو ناول کے ہمہ گیر سروکار''، ماجرا سرائے پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۳

۳۔ الطاف فاطمہ، ''چلتا مسافر''، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۵۱

۴۔ ایضاً، ص ۱۷۷

۵۔ طارق اسماعیل ساگر، ''لہو کا سفر''، ساگر پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۷

۶۔ ایضاً، ص ۲۰۳، ۲۰۲

۷۔ مستنصر حسین تارڑ، ''راکھ''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۵۸۵، ۵۸۴

۱۰۔ طارق محمود، ''اللہ میگھ دے''، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۸۶ء، ص ۳۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۲۔ سلمیٰ اعوان، ''تنہا''، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۳۲

۱۳۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، ''اُردو ناول کے ہمہ گیر سروکار''، ص ۱۱۵

۱۴۔ محمد عارف، ڈاکٹر، ''اُردو ناول اور آزادی کے تصورات''، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۹۴۹

۱۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۶۲۸